خیابان خزاں ۲۰۲۳ء

ڈنسرین انجم بھٹی کی اردو شاعری میں عصری حسیّت

ڈاکٹر فرزانہ کوکب، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو بہاء الدین زکریایونیورسٹی، ملتان

محمد اویس، ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریایونیورسٹی، ملتان

ABSTRACT:

In the decade of 1960s, Pakistani society was intellectually as well as politically was mainly concerned with two major issues of grappling with the question of national identity at home; and global equilibrium of the Cold war. In that era, Urdu poem witnessed many new voices and themes, including women rights and the local identification of global feminism. Nasreen Anjum Bhattai [1943-2016] was one such voice that contributed to Punjabi and Urdu languages. Being painter, radio producer and broadcaster, peace and political researcher and women rights activist her writeups are informed with contemporary sensibilities along with astonishing communicative elements. Though her major works are in Punjabi language but she contributed two books in Urdu: "*Bin Baas*" [Exodus] and "*Tera Lehja Badalney Tak*"[Till change in your tone]. So far, her Urdu poetry is not noticed and analyzed due to her fame in Punjabi poetry. This article analyzes her first book, Bin Baas for its literary merits along with themes of class conflict, patriarch society, gender discrimination, as they are informed by contemporary global intellectual movements and voices.

Keywords: Feminism in Urdu; Cold-war and Urdu Literature; Pakistan and Feminism;

ہر دور میں اُردو شاعری نے موضوعاتی، ہیئتی اور فنی تبدیلیوں کو قبول کیا ہے۔ اُردو شاعری کا آغاز ہوا تو شاعروں نے اسے منفرد موضوعات دیئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نظم میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں نہ صرف اُردو ادب بلکہ پاکستانی معاشرہ بھی تبدیل ہو رہا تھا، تخلیق کاروں نے عصری حسیت کو محسوس کرتے ہوئے نظم میں نئے موضوعات کو جگہ دی۔ ایسے شاعروں میں نسرین انجم بھٹی کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے پنجابی شاعری میں اپنا نام بنایا اور اُردو شاعری کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا۔ ان کی اُردو شاعری میں عصری حسیت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے خواتین کی انفرادی آزادی اور طبقاتی کشمکش کے تناظر میں کئی نظمیں تخلیق کیں۔ اس لیے ان کی اُردو شاعری کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مذکورہ مضمون میں ان کی بھولی بسری اُردو شاعری کو عصری حسیت کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

key words: Contemporary sensibility, New Poem, Modernity, Nasreen Anjum Bhatti

کلیدی الفاظ: عصری حسیت، نئی نظم، جدیدیت، نسرین انجم بھٹی

تخلیق کار اپنے ارد گرد سے تخلیقی وسائل تلاش کرتا ہے۔ جب بھی خارجی دنیا میں کوئی اتھل پتھل ہوتی ہے؛ وہ تخلیق کے ذریعے اس کا اظہار کرنے کے بعد قاری کو اپنی حسیّت (Sensibility) سے آگاہ کرتا ہے۔ بنیادی طور پر حسیّت وہ قوت ہوتی ہے جو فرد کی اندرونی دنیا پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جبکہ اس اثر پذیری کی اصل وجہ بیرونی خلفشار ہوتا ہے۔ ادب میں حسیّت (Sensibility) بطور اصلاح یا تحریک اٹھارہویں صدی کے آخر میں متعارف ہوئی۔ ابتداء میں اس کے نقوش فکشن میں تلاش کیے جاسکتے ہیں مگر بعد میں حسیّت نے شاعری کو بھی متاثر کیا۔ اس طرح حسیّت نے تخلیقی حسیّت (Creative Sensibility) تک کا سفر مکمل کیا۔ حسیّت کو جذباتیت کے مماثل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ تخلیق کار جذبات کے زیر اثر ہی اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ "ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز (Dictionary of Literary Terms) کے الفاظ میں:

> "An important 18th-century term designating a kind of sensitivity or responsivness that is both aesthetic and moral, showing a capicity to feel both for others' sorrows and for beauty .The term is also used in a different sense in modern criticism, the sensibility of a given writer being his or her characteristics way of responding_intellectually and emotionally_to experience".[۱]

حسیّت کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم سادہ حسیّت ہے، سماج میں موجود ہر فرد پر ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح فرد کا عمومی رویہ اس سادہ حسیّت کو ظاہر کرتا ہے جو اعضائے حِس کی مدد سے اس کے تجربات کا حصہ بنتا ہے جبکہ تخلیقی حسیّت اس وقت جنم لیتی ہے جب محسوس کرنے والا اپنے محسوسات کا تخلیقی پیرائے میں اظہار کرتا ہے۔ تخلیقی حسیّت کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے قاری کے احساسات کو ترو تازہ کرے اور پڑھنے والا تخلیقی حسیّت کے ذریعے خوشی یا افسردگی کی کیفیت کو محسوس کرے۔

ادبی دنیا میں وہ تخلیقی ادب ہمیشہ یاد رکھا گیا ہے جس نے عصری حسیّت کو اپنا موضوع بنایا۔ کیونکہ جب لکھنے والا اپنے تجربات اور محسوسات کو تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے تو ادب میں اس کا مقام علیحدہ ہو گا۔ کلاسیک کا درجہ وہی ادب اختیار کرتا ہے جو اپنے عصر سے ہم آمیز ہوتا ہے۔ مغرب میں جب (اٹھارہویں صدی) حسیّت ادب کا موضوع بنی تو کئی لکھاریوں نے اس کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ ایک بات طے ہے کہ جب بھی کوئی تخلیق کار کسی حادثے یا واقعہ کو فوری طور پر اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنائے گا تو قاری اسے کوئی جاسوسی چیز سمجھ لیتا ہے؛ اور اسے وہ تخلیق کسی طلسماتی جہاں کی یاد دلاتی ہے۔ اس لیے وہ عصری حسیّت کو بھی جاسوسیت کے مماثل قرار دینے کی غلطی کرتا ہے۔ جبکہ مغرب میں بھی ابتدائی حسی ناولوں کو جاسوسی قرار دیا گیا۔ ان میں یہ ناول شامل تھے۔ Wilkie Collin's The women in white (1860), Mary Elizabeth Braddon's Lady Audley's Secret (1862), J. Sheridan Le Fanu's Uncle Silas (۱۸۶۴)

حسیّت کسی ایک عہد کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ ہر تخلیق میں۔ گزرے ہوئے عہد یا آنے والے وقت کی حسیّت کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان شاعروں کا جائزہ لیا جائے جو کلاسیکیت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں تو ان کی شاعری میں آج کی حسیّت کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان نمائندہ شاعروں میں نظیر اکبر الہ آبادی، میرؔ، غالبؔ اور فراقؔ شامل ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ہماری زندگی جس قدر پیچیدہ ہو رہی ہے اور انسان خود کو محدود کر رہا ہے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مستقبل میں ایک شاعر کے ہاں کس طرح کی عصری حسیّت ہو گی۔ یوں حسیّت صرف عصر کی نمائندگی نہیں کرتی اور نہ ہی ہم اسے ماضی تک محدود کر سکتے ہیں۔ احتشام علی کا خیال ہے:

> ”حسیّت (Sensibility) ماضی کی کوئی از کارِ رفتہ تحریک نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی ذہنی اُپچ ہے جس کے ذریعے ایک طرف تو فنکار جمالیاتی سطح پر اپنی مختلف حسیّات کو بروئے کار لا کر تخلیقی مواد کے لیے تمثالوں، رنگوں اور علامتوں کا انتخاب کرتا ہے اور دوسری طرف متخیلہ میں فہم کی آمیزش سے تمام مواد کو تحریری شکل میں منقلب کر دیتا ہے۔ شعری عمل میں حسیّت کا تجربہ اس لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ یہاں شعور کے ساتھ ساتھ لاشعور کی کارگزری بھی شعری مواد شامل ہو کر اپنا ادراک کراتی ہے۔“[۲]

جدید شاعری میں عصری حسیّت کا اظہار جدید نظم کی صورت میں نمایاں ہے ۔ خاص طور پر ۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے ہاں نئی صورتحال وقوع پذیر ہوئی۔ جس کی وجہ سے شاعری میں، ہئیتی، موضوعاتی اور لسانی سطح پر تجربات ہوئے۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب میکانکی قدریں اپنے قدم جما رہی تھیں۔ فرد مشینی اور صنعتی دور کا شکار ہو کر اپنی اصل روایات سے دور ہو رہا تھا جس سے بیگانگی اور اجنبیت کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں جس حسیّت نے جنم لیا اس کا اظہار نظم کی نئی صورتوں میں ممکن تھا۔ نظم میں برتے جانے والے موضوعات فرد کی خارجی اور داخلی کیفیات کی بھرپور نمائندگی کر رہے تھے۔ اس عہد کی نظم چونکہ جدید انسان کے مسائل کو پیش کر رہی تھی۔ اس لیے اسے نئی نظم کا نام دیا گیا۔

نئی نظم نے گلوبلائزیشن کے اثرات بھی قبول کیے اور لسانی سطح پر زبان کی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ اُس عہد میں چونکہ لسانی تشکیلات کی تحریک عروج پر تھی اس لیے نئی نظم نے بھی دیگر زبانوں کے لفظوں کے انسلاک کو قبول کیا۔ اس کے علاوہ نئی نظم کو ہئیت کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ چونکہ موضوعات میں تنوع آ چکا تھا اور تخلیق کار کو روایتی اصناف کی تنگ دامنی کا احساس ہونے لگا۔ نظم نے طے شدہ ہیئت سے انحراف کرتے ہوئے پابند سے معری۔ اور آزاد سے نثری نظم (نئی نظم) تک کا سفر کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم میں جو عصری حسیّت موضوع بنی وہ صرف اس مخصوص عہد کی ہیجان خیزی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں زبان اور ہیئت کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ ’ عصری حسیّت ‘ کی اصطلاح مخصوص معنوں میں استعمال ہونے کی بجائے وسیع تناظر رکھتی ہے۔

نئی نظم کی روایت میں نسرین انجم بھٹی [۳] کا نام نہایت اہم ہے۔ ادب کی دنیا میں ان کی بنیادی پہچان بطور پنجابی شاعرہ ہے مگر انہوں نے اردو شعری مجموعہ بعنوان " بن باس "(۱۹۹۴ء) بھی شائع کیا۔ نسرین انجم بھٹی کی اردو شاعری کو فراموش کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جن موضوعات کو جگہ دی ہے وہ نئی نظم کے لیے یکسر منفرد اور اچھوتے تھے۔ انہوں نے عصری حسیّت کو قبول کرتے ہوئے نہ صرف فکری بلکہ ہئیتی اور لسانی سطح پر بھی نئی نظم کو عروج عطا کیا۔ نسرین انجم بھٹی نے جب اردو شاعری اختیار کی تو اس وقت نئی نظم میں ہیئت کا مسئلہ درپیش تھا۔ تمام شاعر مقدور بھر کوشش کر رہے تھے کہ اپنے خیالات اور جذبات کی شدت کو بیان کرنے کے لیے کوئی نیا راستہ اختیار کیا جائے۔ ان نئے لوگوں میں مبارک احمد، انیس ناگی، افتخار جالب، افضال احمد سید وغیرہ شامل تھے۔ لہذا ان تمام شاعروں نے جدید عہد کے فکری انتشار کو محسوس کرتے ہوئے؛ نظم کی ہئیتی توڑ پھوڑ کی۔ نظم کی اس نئی شکل کو ' نثری نظم ' کا نام دیا گیا۔ نثری نظم کو طویل عرصہ تک رد و قبول کے سلسلے سے گزرنا پڑا۔ اس ہیئت میں ایسی کیا کشش تھی کہ سرعت کے ساتھ یہ اردو شاعری کا حصہ بن گئی ؟ ظاہر ہے کہ مذکورہ ہیئت میں شاعر کا خیال اپنی صورت بگاڑے بغیر صفحہء قرطاس پر منتقل ہو سکتا تھا۔ ایک شاعر کے لیے اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں تھا کہ جیسا وہ محسوس کرتا ہے اسے نظم کا روپ دے سکتا ہے۔ جب ایک انٹرویو میں نسرین انجم بھٹی سے پوچھا گیا کہ آپ نے نثری نظم کا انتخاب کیوں کیا تو ان کا جواب کچھ یوں تھا:

> "شروع شروع میں میں نے آزاد نظم بھی کہی ہے لیکن میرا Thought اتنا Powerful تھا کہ اس میں سماتا تھا۔ میری کمیٹ منٹ تھی۔ جس Cause کے لیے مجھے لکھنا تھا، وہ اس میں پورا نہیں ہوتا۔ وہ اسے توڑ کر باہر نکل جاتا تھا۔ میں Content کو زیادہ ترجیح دیتی ہوں ہیئت پر۔" [۴]

نسرین انجم بھٹی ستر کی دہائی میں بطور شاعرہ اپنی پہچان مضبوط کر چکی تھیں۔ انہوں نے روایتی موضوعات کو نظم کرنے کی بجائے اپنے عہد کی حسیّت کو تخلیقی انداز میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں یہ شعوری کوشش نظر آتی ہے کہ وہ نظم کو نئی حسیّت عطا کر رہی ہیں۔ انہوں نے جس دور میں نظم لکھنا شروع کی تھی وہ دور ہر اعتبار سے انارکی کا شکار تھا۔ لوگ مذہبی شدت پسندی کی طرف بڑھ رہے تھے اور سماج اخلاقی قدریں کھو رہا تھا۔ یہ وہی دور تھا کہ جب ہمارے ملک کو بدترین مارشل لاء کا سامنا تھا۔ نسرین انجم بھٹی نے اپنے اردگرد ہونے والی ہلچل کو قریب سے دیکھا۔ ایک تخلیق کار ایسے غیر انسانی

رویوں سے ہمیشہ بغاوت کرتا ہے۔ وہ تمام پابندیوں کا کشادہ دلی سے سامنا کرتا ہے اور اپنے نظریے کے ساتھ جیتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابل لوگ ہمیشہ حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ نسرین انجم بھٹی اس تلخ تجربے کو اپنی نظم " میرے آزمانے والے" میں کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

" آندھی بہت تُندی سے آئی اور شمال کی جانب مڑ گئی

مگر چٹانوں نے کانپنا نہیں سیکھا

اس میں آزمانے والی کونسی بات تھی

یہ الگ بات ہے مگر

'میرے آزمانے والے مجھے آزما کے روئے" [۵]

انہوں نے اپنی بیشتر نظموں میں علامت کا استعمال کیا ہے۔ جب کوئی شاعر علامت کو اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے، تو اس کا مقصد اپنے خیال میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ قاری اس علامت کے ذریعے کئی زاویوں سے نظم کی پرتیں کھولتا ہے۔ علامت کسی بھی شے کو جامد سے جاندار میں تبدیل کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی مجرد حقیقت کو توڑ پھوڑ کر پیش کرتی ہے؛ جس سے مخصوص طرح کا فکری نظام جنم لیتا ہے۔ علامت کے ذریعے ہی بڑی شاعری کا ظہور ہوتا ہے۔ جبکہ نظم میں علامت کی وہی حیثیت ہوتی ہے؛ جو راستے پر سنگ میل کی۔ علامتوں کے ذریعے کسی بھی نظم کے مافی الضمیر کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔[٦] نسرین انجم بھٹی کی نظمیں بھی علامتوں سے بھرپور ہیں۔ ان کی علامتیں عصری حسیّت کی نمائندگی کرتی ہیں۔" شناخت کا دن" سے چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

"دیکھو خوشبو کا رنگ خون جیسا ہے

مجھے جیب میں ڈال کر اس کے پاس نہ لے جاو

وہ لوگوں کی جیبے پھولنے کا عادی نہیں ہے

مجھے توڑ کر ہوا میں بکھیر دو

اسے ہوا پینے کی لت ہے۔۔۔

-پھر ہوا چلی۔۔۔ پھر میری آنکھیں نگر نگر جلیں

لوگ خواہشوں کے اسیر ہوئے تو بادلوں سے اتر آئے

کیونکہ جب ہوا چلتی ہے تو بادل بکھر جاتے ہیں لوگ ننگے ہو جاتے ہیں"[۷]

مذکورہ نظم میں 'ہوا' علامت کے طور پر ظلم، بربریت اور وحشت زدہ ماحول کی عکاسی کر رہی ہے۔ ہر عہد کے سماج میں ایک ایسا گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو اپنی منفی خواہشات کی تکمیلیت کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ شاعرنے جس ہوا کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ماحول کو پر سکون کرنے کی بجائے اسے مزید گھٹن میں مبتلا کرتی ہے۔ جبکہ "کس کا لہو کون مرا ہے" اور "اگر مجھے یقین ہوتا" جیسی نظموں میں بھی علامت کا استعمال ہوا ہے۔ موخر الذکر نظم اس وجہ سے بھی اہم ہے کیونکہ شاعرہ نے ایک معروف سیاسی شخصیت کی بے گناہ پھانسی کو موضوع بنایا ہے:

"خدا کے تیسری بار بھی بٹ جانے پر
تو میں عدالتوں پر یقین رکھتی۔۔ پھانسیوں پر نہیں
پھانسیوں پر یقین رکھتی، پھانسیوں پر نہیں
پھانسیوں کی وجہ پر یقین رکھتی، عدالتوں کے فیصلے پر نہیں
کیونکہ بعض وجوہات کی بنا پر
میں یقین رکھنا بھول چکی"[۸]

ذوالفقار علی بھٹو، نسرین انجم بھٹی کے سیاسی ہیرو تھے۔ انہوں نے اپنی پنجابی نظم "شہید ذوالفقار علی بھٹو دی وار (میں مرزا ساگر سندھ دا میری راول جنج چڑھی)" میں بھی اپنے دُکھ کو شدت کے ساتھ بیان کیا۔ جبکہ "اگر مجھے یقین ہوتا" میں انہوں نے 'خدا' کی علامت کے ذریعے نظم کے فکری نظام کو وسیع تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ نسرین انجم بھٹی نے ان نظموں میں نعرے یا جوشِ خطابت کا سہارا نہیں لیا بلکہ ان نظموں کا خمیر مقامیت سے تیار ہوا ہے۔ جس کے

بعد سیاسی نظمیں محض آدرش تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان میں سماج کے دیگر مسائل کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ شمیم حنفی کا خیال ہے کہ:

"بَن باس کی ایسی نظمیں بھی، جن کی سیاسی سطح بہت واضح ہے، ان میں بھی نسرین نے اپنی دہشت اور ملال کے اظہار کو کبھی نعرہ بازی اور خطابت تک نہیں پہنچنے دیا۔ان کے ملال کا ایک نمایاں زاویہ ایک تنگ نظر روایتی معاشرے پر ادعائیت کے جبر، اور اس جبر کے نتیجے میں، اقلیتی فکر، طبقے اور گروہ کے تجربوں سے منسلک ہے۔ 'بَن باس' کی متعدد نظموں کا خمیر سیاسی ادراک کی زمین سے اٹھا ہے، اس کے باوجود یہ روایتی معنوں میں سیاسی نظمیں یا کسی منصوبے کے تحت کسی معین نظریے کی قیادت میں لکھی جانے والی نظمیں نہیں ہیں۔" [۹]

نسرین انجم بھٹی کی نظموں کا مرکز عصری حسیّت ہے۔ ان کے موضوعات کا اپنے عصر کے ساتھ تال میل محسوس کیا جاسکتا ہے۔ تخلیق کار اپنے عہد سے تخلیقی مواد تلاش کرتا ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی بیشتر نظموں کا مرکز محبت ہے ۔ مگر اس محبت کے تجربے میں چھپی کسک، محرومی اور ناآسودگی انہیں ہم عصر شاعروں سے علیحدہ کرتی ہے۔ ان کی نظم "ایک دوست کی عیادت پر" دیکھئے:

"پھول بھی مرجھاتے ہوئے کچھ دیر لگتی ہے مگر
دوست دوستوں کے ہاتھوں سے
مسکرامسکراکر گر جاتے ہیں
یہ محبتیں---یہ قاتل محبتیں
کہی بھی نہ جائیں سہی بھی نہ جائیں
بہت ہنستے ہنستے بھی پھیپھڑے دُکھنے لگتے ہیں
باہر کیسی آندھی ہے---"[۱۰]

ہر تخلیق کے نزدیک اس کا عہد لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ شاعرہ نے محبت (داخل) اور پتوں کے گرنے (خارج) کی آمیزش سے انسان کی جدید حسیّات کو موضوع بنایا ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی نظموں کا اہم موضوع بے یقینیت بھی ہے۔ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ خوفزدہ اور تشکیک کا شکار رہا ہے۔ جب شاعر کسی انسان کی اس کیفیت کو گرفت میں لیتا ہے تو یہ اس عہد کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ شاعر نے بھی بے یقین صورتحال کو موضوع بنایا ہے۔ بے یقینی ماحول میں پیدا کی گئی گھٹن سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ کہ جہاں بندوقوں کے سائے ہو، اور لوگوں کی زندگیاں خوفناک دائروں میں چل رہی ہیں تو ایسے ماحول میں گھر کسی مورچے کی طرح لگتے ہیں؛ اور شام بارود سے اٹی محسوس ہوتی ہے۔ نسرین انجم بھٹی نے اس عصری حسیّت کو اپنی نظم "توقف" میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

"چلو ہم مورچوں میں چھپ کے دیکھیں
شام کی بارودی آنکھیں صبح کے ہونٹوں سے ملتی ہیں
تو کیا ہوتا ہے آؤ
ابھی آتے ہیں ہم دونوں"[۱۱]

نسرین انجم بھٹی کی نظموں کی نمایاں خوبی ان میں موجود تخلیقی وفور ہے۔ وہ اپنی مختصر نظموں میں بھی بڑے موضوع کو پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے طویل نظموں کی طرح مختصر نظموں میں بھی عصری حسیّت کے مختلف پہلوؤں کو تخلیقی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم " ابابیل" ان کے ایسے تجربے کی غماز ہے کہ جس میں تشنگی کے احساس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک انسان اپنا دائرہ مکمل کرنے کے لیے زندگی بھر بھاگ دوڑ کرتا ہے مگر اس کے باوجود وہ ناآسودہ رہتا ہے۔ شاعرہ نے منفرد تلازمہ کے ذریعے زندگی کی حقیقت کو منکشف کیا ہے:

"ابابیل! پیاسی ابابیل
گہرے سمندر پہ گر کے اٹھی
زندگی تیرا نام۔۔۔
کوئی پوچھے تو میں یہ کہوں پیاس ہے۔۔۔"[۱۲]

جب نظم مختصر ہو تو اس میں خطرہ ہو تا ہے کہ شاعر کی بات کہیں ادھوری نہ رہ جائے۔ مگر نسرین انجم بھٹی کی مختصر نظموں کے امیجز مکمل محسوس ہوتے ہیں۔ نسرین انجم بھٹی کی مختصر نظموں کے متعلق زاہد مسعود کا خیال ہے:

> ”نسرین انجم بھٹی نے چھوٹی بڑی نظموں کے ذریعے تخلیقی شاعری کا ہنر پیش کیا مگر کہیں بھی انہوں نے جان بوجھ کر نظم کو بڑھانے اور گھٹانے کا تردد نہیں کیا۔ بلکہ نظم کے سنٹرل آئیڈیا پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ یعنی ان کے نزدیک وہی نقطہ اہم تھا جسے وہ بذریعہ نظم بیان کرنا چاہتی تھیں۔ کم سے کم اور موثر الفاظ کے ذریعے انہوں نے بات مکمل کرنے کی کوشش کی اور الفاظ کا بہترین چناؤ کیا جس نے ان کی نظموں کو بے پناہ تاثیر سے معمور کیا۔“[۱۳]

نسرین انجم بھٹی کی بیشتر نظموں کے ذریعے عصری سیاق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مادہ پرست سماج کا المیہ انہوں نے نظموں میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ جس سے ان کی عصری حسیّت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مادی زندگی نے انسان کو اپنی ذات کے خول میں سمٹنے کا موقع فراہم کیا جس سے ناامیدی پیدا ہوتی ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی نظم ” چڑیا چپ چپ، بادل گم صم “ بھی اس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے:

”چڑیا چُپ چُپ ٗ بادل گُم صُم
سڑکیں تنہا
بارش کبھی کبھی برسی
کبھی کبھی ترسی
دھوپ دُکھتے ہوئے ہونٹوں کی طرح ہنستی ہے
کھڑکیوں میں کوئی چہرہ نہیں
زندگی آرڈر پر بنتی ہے بِگڑتی ہے بابو لوگ بریف کیس اٹھائے
زندگی خریدنے

ہر صبح دوڑے جاتے کہاں؟
جہاں تک سڑکیں جاتی ہیں"[۱۴]

مذکورہ نظم میں زندگی کی اصل روح کو تلاش کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ لوگ اپنے معمولات میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ وہ فطرت سے کنارہ اختیار کر چکے ہیں۔ صبح سویرے جب لوگ زندگی خریدنے نکلتے ہیں تو یقیناً ان کے لیے تمام مناظر بے معنی ہوتے ہیں۔ شاعرہ نے جس رویے کو بیان کیا ہے؛ وہ اصل میں فرد کی طرف سے خلق کیا گیا ہے۔ یہ نظم مادی اور فطری زندگی کی کشاکش کو ظاہر کر رہی ہے۔

نسرین انجم بھٹی جس دور میں اردو شاعری کر رہی تھیں۔ اس وقت فرد کو وجودی مسائل کا سامنا تھا۔ وہ عہد علامتی تھا اور شاعر اپنا مدعا اشاروں کنایوں کے ذریعے بیان کرتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ وہ اظہاری پابندیاں تھیں جن کا سامنا ہر تخلیق کار کو کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی مرکزی اہمیت کو واضح کرتی ہوئی نسرین انجم بھٹی کی نظم "تم نے" سے چند سطریں دیکھیے:

"کون کون کس کس پر سے وار دیا گیا۔۔۔ انسان بہت قیمتی ہے
اس پر سے ایک اور انسان وار دیا جاسکتا ہے۔۔۔
یہ بادشاہ کا حکم ہے
کہ آئینے میں رونے والا۔۔۔ آئینے میں ہی روئے
اور اس کے آنسو پینے والا ہمیشہ پیاسا رہے۔۔۔"[۱۵]

مذکورہ نظم میں انسانی وجود کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کس قدر ارزاں ہے، یہ اپنی جگہ ایک اہم سوال ہے۔ انسان کی وقعت ایک موہوم نشان سے زیادہ نہیں اور وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس کی انفرادی اہمیت مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ نسرین انجم بھٹی نے وجودیت کے اس مسئلے کو نہایت عمدگی سے عصری حسیّت کے طور پر نظم کا حصہ بنایا ہے۔

شاعر سماج کے پسے ہوئے طبقات کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اگر ان زمینی اور حقیقی مسائل کا ذکر نہیں کرے گی تو اس کی تخلیقات پر کئی اعتراضی سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ انتہائی نازک ہوتا

ہے، اگر وہ بلند آہنگی یا شدت کے ساتھ اس کا اظہار کرے گا تو اس کی شاعری محض نعرہ بن کر رہ جائے گی۔ نسرین انجم بھٹی نے جب عصری حسیّت کو محسوس کرتے ہوئے طبقاتی تفاوت کو موضوع بنایا تو اپنی تخلیقیت کو زائل نہیں ہونے دیا۔ ان کی نظم ''رشتے سرشتے'' اس پہلو کی روشن مثال ہے کہ جس میں انہوں نے وسیع تناظر کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے:

''مجھے یاد ہے جب تو پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا تو
ہمارے گھر میں پہلا فاقہ تھا۔۔۔
اور ہمارے ہاں دِیا بھی نہیں جلایا گیا تھا کہ ہماری آنکھوں کی گھبراہٹ
ابھی ناپُختہ تھی۔۔۔
اور ہم ماں باپ بیٹے بیٹیوں کے درمیان کوئی رشتہ طے نہیں ہوا تھا
شامِ غریباں کی طرح ہم چپ تھے
جذبوں کی آوازیں اپنی اپنی 'مٹھیوں میں دبائے'۔۔۔
نظریں اِدھر اُدھر بھٹک جاتی تھیں جیسے مرنے والے جذبے کو ہم نے مارا
اسی لیے ہم کبھی اکٹھے نہیں بیٹھتے تھے''[۱٦]

بھوک، افلاس اور غربت ہمارے خطے کے بنیادی مسائل ہیں۔ اس مسئلے پر جب بھی کسی شاعر نے قلم اٹھایا تو جذباتی انداز کسی نعرے کی طرح گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ترقی پسند شاعری کی مثال دی جا سکتی ہے۔ مگر مندرجہ بالا سطروں میں کسی آدرش کو بیان کرنے کی بجائے فن کو اہمیت دی گئی ہے۔

'عورت' نسرین انجم بھٹی کی بیشتر نظموں کا مرکزی موضوع ہے۔ انہوں نے تانیثیت کو بطور رویہ اختیار کیا مگر اپنی بات نہایت سہولت کے ساتھ کی ہے۔ اپنی ہم عصر شاعرات کی طرح انہوں نے اونچے لہجے کی بجائے دھیما انداز اختیار کیا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جو سماج کی ثقافتی اور تہذیبی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرنے کی خواہش مند ہے۔ انہوں نے مقامی عورت کو نظموں کا حصہ بنایا ہے جس سے تانیثیت کی نئی صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ نسرین انجم بھٹی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے پنجاب کی عورت کو پورٹریٹ کیا ہے۔ ان کے ہاں ایسی عورت

کی جھلک ملتی ہے جو مرد سماج میں بھی پیداوری وسائل کو بڑھانے کے لیے اپنے مکمل وجود کے ساتھ موجود ہے۔ان کی نظم ''تانبے کی عورت'' مقامی عورت کی عکاسی کر رہی ہے:

''ہتھوڑے کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن
جچے کیوں نہیں
اور تانبے کی عورت
تپی۔۔۔ تمتمائی۔۔۔ مگر مسکرائی۔۔۔ جمی ہی رہی
کیوں پگھل نہ سکی
پائوں جلتے رہے۔۔۔ وہ کڑی دھوپ میں بھی کھڑی ہی رہی
اُس کے آنے تلک
لَوٹ جانے تلک
نہیں اس کو سچ مچ کسی بات کی بھی
کوئی سُدھ نہیں۔۔۔''[۱۷]

اسی طرح ان کی نظم ''موسموں کے منہ میں لکڑی کی زبانیں ہیں'' بھی دیہی عورت کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی نظموں میں جذباتی شدت بلند آہنگی کے ساتھ وارد نہیں ہوتی بلکہ وہ جب بھی عورت کو موضوع بناتی ہیں تو خاموشی کے ساتھ عورت کی وجودی کیفیات کو مجسم انداز میں پیش کرتی ہیں۔ عورت کے حوالے سے عصری حسیّت ان کی نظم میں کچھ یوں جگہ بناتی ہے:

''میری ماں نے مجھے چیونٹیوں کے منہ میں دیکھا تو بچانے دوڑی
چیونٹیوں کے ساتھ میں بھی اس کے پائوں تلے آگئی
ہائے! میں نے کس کس کو کیسے کیسے دُکھ دیے
مرا وصل کھیتوں میں رُلتا پھرا اور ہریالی کیڑے لے گئی
میرا ہجر بانس کی صلیب پر لٹکا 'دُور رہو' 'دُور رہو' پُکارتا رہا

اور میرے ہڈیوں میں تیرے پیار کی بد دعا تھک گئی۔۔۔"[۱۸]

مندرجہ بالا نظموں میں نسرین انجم بھٹی کا تانیثی رویہ عصری حسیّت کے ساتھ ہمارے سامنے منکشف ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف انہوں نے عورت کو جنس اور محبت کے حوالے سے بھی دیکھا ہے۔ جس میں عورت بطور 'شے' مرد سماج میں موجود ہے۔ نسرین انجم بھٹی جنس کو محبت کے طور پر نہیں دیکھتیں بلکہ وہ اسے مرد کی خواہشات کی تکمیل قرار دیتی ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں جنس اور محبت کے درمیان ایک واضح لکیر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی نظم "اب تک "دیکھئے کہ جس میں بادشاہ سے مراد مرد ہو سکتا ہے:

"مجھے تندور پر لے جانے والا میرا بچہ نہیں تھا اور نہ میں اس کی ماں
مگر میں پھر بھی ٹوٹے ہوئے پتن پر کھڑی رہی
نہ حق !نہ مہر!
بے مراد کہیں بھی بے مراد رہ سکتا ہے۔۔۔
چوڑیوں کے پیچھے ہاتھ تند توڑیں یا جوڑیں
اب میں نہیں جڑتی
بادشاہ! میں سچ مچ پھول نہیں اگاؤنگی مجھے میرے خواب معاف کر دیے
جائیں"[۱۹]

جبکہ " شناخت پریڈ"میں محسوس کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرد خود کو لبرل ڈکلیئر کرنے کے بعد عورت کو جنسی کھلونا سمجھ لیتا ہے اور وہ اپنی تمام خوشیاں اس کے جسم میں تلاش کرتا ہے جبکہ عورت کی خواہشات کو فراموش کر دیا جاتا ہے:

"جسم کے لفظوں سے رات کے پیرائے میں لکھی جانے والی چیز ہوں
دن میں تمہیں کیسے پہچانوں
وردی سونگھ کر کتے ساتھ چلتے ہیں یا راستہ چھوڑ دیتے ہیں
اور کھڑکیوں سے باہر فٹ پاتھ پر گرے ہوئے 'سوکھے پھولوں کے ہار

اور گجرے ان کے کس کام کے
وہ نہ خوابوں کے مسافر نہ خوشبو کے سوداگر
نہ لیفٹ نہ رائیٹ۔۔۔ عین درمیان میں۔۔۔ لبرل۔۔۔ غیر جانبدار" [۲۰]

نسرین انجم بھٹی جب محبوب سے محبت کا اظہار کرتی ہیں تو وہ محبت میں خود کو فراموش کر دینا چاہتی ہیں۔ انسان کے اندر یہ جذبہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ جب وہ محبت کو عزیز از جان تصور کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اس کا محبوب بے رخی سے کام لے تو وہ اس رویے کو بھی محبت کا کوئی رنگ قرار دیتا ہے۔ مذکورہ نظم نگار بھی اپنے محبوب کی خاطر سب کچھ تج دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک محبت سب سے اعلی اور ارفع جذبہ ہے۔ اس بارے میں انیس ناگی کا خیال ہے کہ:

> "نسرین انجم بھٹی کی نظمیں ہر عورت کی شاعری کی طرح اپنی معنوی تکمیل مرد کے سہارے کرتی ہیں لیکن مرد بے وفائی کا نام ہے۔ نسرین انجم بھٹی بے وفائی کو استعارہ بنا کر اسے اپنی خارجیت پر محیط کر دیتی ہے۔ بے وفا مرد ایک بے وفا نظامِ زیست بن جاتا ہے جو فرد کو اس کی ذات سے محروم کر کے اسے جذباتی اور قدری نظام میں رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی نظمیں بے حد داخلی ہیں، اس لیے ان میں خود کلامی کا لہجہ حاوی ہے۔" [۲۱]

"بَن باس" میں اپنے محبوب کے لیے کئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ جس میں 'محبت کی پہلی، تیسری، چوتھی، پانچویں، اور آخری نظم' جیسی نظمیں مضبوط کرافٹنگ کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم کرتی ہیں۔ " محبت کی سب سے پہلی نظم" دیکھئے کہ جس میں محبوب کی بے وفائی کو بھی محبت کا کوئی رنگ قرار دیا گیا ہے:

"میرے بادشاہ!
میں نے آگ پینا سیکھ لی ہے۔۔۔
تم ٹھنڈی ہوا اوڑھ کر مجھ سے ملا کرو
بادلوں کا پیراہن تمہیں اچھا لگتا ہے۔۔۔

تمہاری آواز میں صدیوں کا سحر ہے اور صداقتوں کا غرور
تمہارا دل کائنات کا مرکز ہے
اور تمہاری آنکھیں زندگی کی بشارت
مرے بادشاہ! تمہاری قامت پیغمبرانہ ہے
اور میرا وجود موم کی شمع۔۔۔
مجھے دھڑکنے کے لیے تمہارا لمس چاہیے"[۲۲]

نسرین انجم بھٹی کی نظموں کا فکری جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں حِسی ادراک موجود ہے جو عصر کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ جبکہ دوسری طرف وہ اُس اسلوب سے بھی ناواقف نہیں ہیں جو اُس مخصوص عہد کی ضرورت تھا۔ ان کی اکثر نظموں میں انگریزی اور پنجابی کے الفاظ ملتے ہیں جس سے لسانی تشکیلات کا عمل واضح ہوتا ہے ۔نسرین انجم بھٹی نے عصری حسیّت کو صرف بطور فکری رویہ نہیں لیا بلکہ لسانی سطح پر بھی نظموں میں مختلف تجربات کیے ہیں۔ نسرین انجم بھٹی کی ایسی نظموں میں 'اندازہ' ، ' آپے رانجھا ہوئی '، ' ہم لڑکیاں '، ' دھانی سورج رے '، ' وہ اور میں ' ، اور ' ہم دونوں ' وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام نظموں میں اردو کا دیگر زبانوں سے انسلاک دیکھا جاسکتا ہے۔

نسرین انجم بھٹی ذولسانی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے پنجابی شاعری کے ذریعے لکھنا شروع کیا مگر بعد میں اردو نظم کو وسیلہء اظہار بنایا۔ انہوں نے نظم کی داخلی اور خارجی سطح پر تشکیل نو کی۔ اس طرح ان کی نظموں میں بیانیہ، ڈرامائی اور مکالماتی انداز دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی نظمیں نئی جہات میں سفر کرتی ہیں اور قاری منفرد شعری آہنگ کو محسوس کرتا ہے۔ وہ نئی نظم کی روایت میں پہلی شاعرہ ہیں کہ جنھوں نے اپنی نظموں میں عصری حسیّت کو فکری، ہیئتی اور لسانی سطح پر نئے احساس کے ساتھ پیش کیا۔ نسرین انجم بھٹی کی فراموش شدہ اردو شاعری یہ استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا از سرِ نو مطالعہ کیا جائے تا کہ یہ دیکھا جاسکے کہ انہوں نے اپنے ارد گرد پھیلے جنگل کی مہک کو مختلف کرداروں کے ذریعے کس طرح سونگھنے کی کوشش کی ہے اور عصری حسیّت کو پیش کرتے وقت اپنے معروض سے کس انداز میں ہم کلام ہوئی ہیں۔

حوالہ جات

1. Chris Bladrick,Dictionary of Literary Terms, UK, Oxford University Press, 2015, P:329

۲. احتشام علی، جدید اردو نظم میں عصری حسیّت، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۲۰

۳. نسرین انجم بھٹی ۲۶ جنوری ۱۹۴۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سندھ سے حاصل کی۔ بعد ازاں اورینٹل کالج، لاہور سے ۱۹۶۸ء میں ایم۔اے اردو کیا اور ۱۹۷۱ء میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئیں۔ انکی شادی ۱۹۷۷ء میں لیبر لیڈر کامریڈ زبیر رانا سے ہوئی۔ نسرین انجم بھٹی پنجابی، اردو، سندھی اور انگریزی سے گہری واقفیت رکھتی تھیں۔ انہوں نے جی ایم شاہ کی یادداشتوں کو بھی سندھی سے اردو قالب میں ڈھالا۔ وہ مزاحمتی ادب کی توانا آواز تھیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں ایسی علامات دیکھی جاسکتی ہیں کہ جو ان کے عمیق مشاہدے کی گواہ ہیں۔ نسرین انجم بھٹی نے طویل عرصہ تک بیماری کو جھیلنے کے بعد ۲۶ جنوری ۲۰۱۶ء میں وفات پائی۔ ان کے تین پنجابی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں ''نیل کرائیاں نیلکاں'' (۱۹۷۹ء)، ''اٹھے پہر تراہ'' (۲۰۰۹ء)، ''شاملاٹ'' (۲۰۱۶ء) شامل ہیں۔ جبکہ اردو کا ایک شعری مجموعہ ''بَن باس'' (۱۹۹۴ء) شائع ہوا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی میں اردو کا دوسرا شعری مجموعہ ''تیرا لہجے بدلنے تک'' ترتیب دے گئی تھیں، جو آج کل زیرِ اشاعت ہے۔

۴. نسرین انجم بھٹی (انٹرویو)، مشمولہ، ادبیات (نثری نظم نمبر)، اکادمی ادبیات پاکستان، ص:۳۹۹

۵. نسرین انجم بھٹی، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۲۵

۶. جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۵ء، ص:۹۳

۷. نسرین انجم بھٹی، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۳۲

۸. ایضاً، ص:۲۰۶

۹. شمیم حنفی، نسرین انجم بھٹی (اپنے بَن باس کے ساتھ)، مشمولہ، سویرا ۸۱ (جلد:۹، شمارہ:۱۳)، ص:۲۷

۱۰. نسرین انجم بھٹی، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۳۴

۱۱. ایضاً، ص:۴۸

۱۲. ایضاً، ص:۵۸

۱۳. زاہد مسعود، نسرین انجم بھٹی بطور اردو شاعرہ، مشمولہ، نسرین انجم بھٹی (مرتبہ: زاہد مسعود)، لاہور، بک ہوم، ۲۰۱۹ء، ص:۳۸

۱۴. نسرین انجم بھٹی، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۷۸

۱۵. ایضاً، ص:۱۵۰

۱۶. ایضاً، ص:۱۷۲، ۱۷۱

۱۷. ایضاً، ص:۶۶

۱۸. نسرین انجم بھٹی، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص:۱۹۴، ۱۹۵

۱۹. ایضاً، ص:۲۴۵

۲۰. ایضاً، ص:۲۱۵

۲۱. انیس ناگی (فلیپ)، بَن باس، لاہور، پلس کمیونی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۲۲. ایضاً، ص: ۱۳۷